محمد الیاس خان

تاجک بحران: تاریخی پس منظر، ارتقاء اور تصفیہ کے امکانات

تاجکستان میں جاری خون ریزی نہ صرف ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد نوآزاد وسط ایشیائی ریاستوں کے عالم اسلام کا حصّہ بن کر اس کی قوّت کا مظہر بننے سے متعلق تمام تر توقعات پر پانی پھیرنے کا سبب بنی رہی ہے بلکہ پاکستان کے حوالے سے خطے کی آزادی کے بعد اس کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی روابط کی بحالی اور نتیجتاً معاشی خوشحالی کے حصول کے خوابوں کی تکمیل میں ایک زبردست رکاوٹ بھی بنی رہی ہے۔ ذیل کے مضمون میں ہم تاجکستان میں جاری تین سالہ بحران کا مختلف حوالوں سے تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ حالیہ بحران کی ابتداء اور مختلف مراحل میں اس کے ارتقاء پر بات کرنے سے قبل ہم خطے کی تاریخ، یہاں اسلام کی آمد، روسی استعمار کی گرفت اور اس کی طرف سے اختیار کردہ مذہب مخالف استبدادی اقدامات، مرکزیت پسند استحصالی معاشی پالیسیوں، متحدہ ترکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مصنوعی قومیتوں کی تخلیق اور ان قومیتوں پر مبنی نام نہاد خود مختار جمہوریاؤں کی تشکیل کا مختصراً ذکر کریں گے۔ کیونکہ اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھے بغیر حالیہ بحران کی حقیقت کو سمجھنا اور اس کا ہمہ جہتی تجزیہ کرنا انتہائی مشکل ہے۔

تاجکستان میں اسلام کی آمد

وسطی ایشیا میں اسلام کی آمد سے قبل اس خطے کا ایک حصّہ ایرانی سلطنت کے تابع تھا جبکہ سیر دریا کے شمال کی طرف کا علاقہ خانہ بدوش ترک قبائل کے زیر تسلط تھا۔ علاقے میں ۱۵ سے زائد قبائلی سرداروں کی سلطنتیں تھیں جو ہمیشہ کے لیے آپس کی لڑائیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ اسلام لانے سے قبل یہ قبائل نسطوری عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، زرتشتی مذہب اور بت پرستی کی پرستار تھیں۔

A.R.Gibb کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ نہاوند میں ایرانیوں کی شکست کے بعد ایرانیوں کا پیچھا کرتے ہوئے عرب افواج کا طخارستان کے ترکوں سے پہلی دفعہ سامنا ہوا۔ ۶۴۱ء

میں حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ربیع کو مشرق میں فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کی مہم سونپی جو اُس وقت خراسان کے گورنر تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ربیع نے مرو کو فتح کیا۔ مرو کو اس وقت مرو شاہجہان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہاں کی آبادی وسطی ایشیا میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہے۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مزید فتوحات کا سلسلہ رُک گیا۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دسویں سال حضرت احنف بن قیس کی قیادت میں مسلمانوں نے آمو دریا کے مشرقی کنارے کے علاقوں کو فتح کیا۔ ۶۷۱ء میں حضرت معاویہؓ نے کوفہ اور بصرہ کے پچاس ہزار عرب خاندانوں کو خراسان اور وسطی ایشیا کے پانچ مختلف علاقوں میں آباد کیا۔ اس وقت زیاد بن ابیہ بصرہ اور خراسان کے گورنر تھے۔ زیاد کے بعد اس کے بیٹے عبیداللہ بن زیاد کو گورنر بنایا گیا۔ حضرت معاویہؓ نے عبیداللہ کو بخارا کی فتح کی مہم پر روانہ کیا۔ بخارا اس وقت سغدین کنفیڈریشن کا اہم شہر تھا جہاں "بخارخدات" خاندان حکمران تھا۔ یہاں کے حکمران بندون کی وفات کے بعد تخت کا وارث اس کا کم سن بیٹا تخشدہ بنا۔ لیکن اس کی کم سنی کی وجہ سے عملی طور پر اس کی ماں قبج خاتون نے امور مملکت کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

۶۷۲ء میں عبیداللہ نے بیکند کو فتح کیا اور اسے خلافت اسلامیہ میں شامل کیا۔ بیکند بخارا سے صرف پانچ فرسخ (تقریباً چھ کلومیٹر) کے فاصلے پر تھا۔ بخارا پر حملے کے نتیجے میں قبج خاتون نے عبیداللہ کے ساتھ بھاری تاوان کی شرائط پر صلح کی۔

۷۰۴ء میں حجاج بن یوسف کی طرف سے قتیبتہ بن مسلم خراسان کے گورنر مقرر ہوئے۔ چنانچہ سلطنت بخارا پر حملوں کا از سرِ نو آغاز ہوا۔ اس وقت بخارا کی سغدین سلطنت کا فرمانروا وردان خدا تھا جس نے تخشدہ کو تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا تھا۔ قتیبہ نے بخارا کو چار دفعہ فتح کیا۔ اس نے ہزاروں عرب خاندانوں کو بخارا میں آباد کیا۔ مسجدیں تعمیر کیں۔ قتیبہ نے تخشدہ کو بخارا کا حاکم رہنے دیا جو اسلام لے آیا تھا، اور اپنے بیٹے کا نام قتیبہ رکھا تھا۔ اس کے بعد قتیبہ نے شاش [تاشقند] اور فرغانہ کو فتح کیا۔ قتیبہ نے اس کے بعد چینی ترکستان کا رخ کیا۔ ۱۲۰ ہجری تک موجودہ تاجکستان کے تمام علاقے اسلامی خلافت کا حصّہ بن چکے تھے۔ بعد میں خلافت اسلامیہ کے کمزور ہونے پر یہاں مطلق العنان بادشاہتیں اور سلطنتیں وجود میں آئیں۔ خوارزم شاہی سلطنت، تیموری سلطنت، سلجوقی سلطنت اور آل سامان کی شیبانی سلطنت یہاں کی مشہور اسلامی سلطنتیں ہیں۔ روسیوں کے وسطی ایشیا میں آمد کے وقت علاقہ تین چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ خانیت خیوا، خانیت خوقند اور امارت بخارا۔

روسی استعمار کی گرفت میں

۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کے عرصہ میں روسیوں نے متحدہ ترکستان کے تمام علاقے پر

قبضہ کر لیا۔ روسیوں نے ۱۸۶۴ء میں چمکند پر، ۱۸۶۵ء میں تاشقند پر اور مئی ۱۸۶۸ء میں سمرقند پر قبضہ کیا۔ جون ۱۸۶۸ء میں امیر بخارا نے زرا بولاق کی جنگ میں روسیوں کے ہاتھوں شکست کے بعد روسیوں سے صلح کی جس کے نتیجے میں بخارا کی آزاد حیثیت ختم ہو گئی اور یہ رشین پروٹیکٹریٹ بن گیا۔ ۱۸۷۳ء میں خیوا پر روسیوں نے قبضہ کیا۔ ۱۸۷۵ء میں روسی خوقند پر چڑھ دوڑے۔ ۱۸۸۴ء میں مرو روسیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ فرغانہ کی خوقند خانیت کے علاقوں کو روسیوں نے براہ راست اپنا صوبہ بنا لیا۔ تاشقند اس صوبے کا دارالحکومت تھا۔ اس سے قبل وہ قازقستان کو ۱۷۴۶ء میں اپنا زیر حفاظت علاقہ اور پھر بتدریج روسی صوبہ بنا چکے تھے۔ بخارا اور خیوا ریاستوں کو اگرچہ روسیوں نے شکلاً برقرار رکھا لیکن عملاً ان کی آزادی چھین کر انہیں زیر حمایت علاقوں کی حیثیت دی۔

بالآخر یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو سوویت روس کی سرخ افواج نے جنرل فرنز Frnnze اور کوبی شیف Kuibyshev کی قیادت میں (خیوا کے حکمران سید عبداللہ کو اپنا کٹھ پتلی بنا کر خیوا پر قبضہ کرنے والے) خان جنید خان کی افواج کو شکست دی۔ جنید خان نے قراقرم میں پناہ لی اور وہاں عرصے تک مردان احرار کے ساتھ مل کر روسیوں کے ساتھ لڑتا رہا۔ سید عبداللہ پہلے ہی برائے نام حکمران تھا۔ اس نے حکمرانی سے دستبرادی کا اعلان کیا اور یوں روسیوں کی طرف سے خوارزم (خیوا) سوویت جمہوریہ کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں سرخ افواج نے غدّاروں کے تعاون سے ملت اسلامیہ ترکستان کے آخری حصار (بخارا) پر بھی قبضہ کر لیا۔ امیر بخارا نے بھاگ کر کابل میں پناہ لے لی۔

اسلامی شناخت بدلنے کی کوشش

۱۹۲۴ء میں بالشویک سرخ فوجوں کی طرف سے ترکستان [وسطی ایشیا] پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد کمیونسٹوں نے ترکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے جغرافیائی، مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے اس واحد علاقے کو کئی انتظامی یونٹوں میں تقسیم کیا۔ غرض یہ تھی کہ کسی بھی وقت متحدہ ترکستان کی وحدت روسی بالادستی کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ یہاں رہنے والی مختلف قومیتیں اور قبائل یہاں صدیوں سے اکٹھی رہتی رہیں۔ اور خاص کر اسلامی فتوحات کے بعد ان کی واحد شناخت اسلام تھا۔ قبائلی شناخت کبھی بھی ان کے درمیان وجہ نزاع نہیں بنی۔ وہ ایک واحد تہذیب و ثقافت، متحدہ مذہبی شناخت اور اسلامی اخوت کے رشتوں میں منسلک تھے۔

کمیونسٹوں نے علاقہ کو اس طور پر تقسیم کیا کہ ہر ریاست میں مختلف نسلی اور قبائلی اقلیتوں کو رہنے دیا گیا۔ تاکہ ان کے اندر مستقل نزاع کا سلسلہ برقرار رکھا جا سکے۔ ان ریاستوں پر جعلی جغرافیائی پس منظر، نام نہاد قومی زبان اور جعلی معاشی مفادات مسلط کی گئیں۔ اور یوں ترکستانی مسلمانوں کی روایتی اسلامی شناخت کو تباہ و برباد کرنے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بعد کے ادوار میں اسلام کے خلاف منظم مہم

چلائی گئی۔ مسجدوں کو بند کر دیا گیا۔ انہیں شہید کر دیا گیا۔ سینما گھروں تھیٹروں چائے خانوں اور اصطبلوں میں بدل دیا گیا۔ مدرسوں پر پابندی لگا دی گئی۔ سرکاری علماء کی سرپرستی میں بہرحال ایک محدود تعداد میں مدرسوں اور مسجدوں کو برقرار رکھا گیا۔ کمیونسٹوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے علماء کو سرکاری سرپرستی میں مسلم سپریم بورڈز کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی نمائندگی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جن کا کام بیرونی دنیا کے دورے کر کے اور کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کر کے سوویت حکومت کی "مذہبی رواداری" کا پرچار کرنا تھا۔

لسانی اور قبائلی شناخت کو خود ساختہ "قومیت" میں بدل کر واضح طور پر کھینچی گئی قومی حدود میں مقید کرنے کا مقصد سٹالن کی طرف سے روسی استبدادی گرفت کو دوام بخشنا تھا۔ ان قومی ریاستوں کی حدود کی تشکیل اس طرز پر کی گئی کہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اکثریتی آبادی کے وسائل پر انحصار کرنے والی زیادہ سے زیادہ اقلیتیں ہر ایک ریاست میں پیدا کی جا سکیں۔ تاکہ ماسکو کو ہمیشہ کے لیے "پاور بروکر" اور "پیس میکر" کا رول ادا کرنے کا موقع ملا رہے۔ موجودہ تاجکستان کی تشکیل اولاً ۱۹۲۴ء میں "ازبکستان سوویت سوشلسٹ ریپبلک" کے اندر ایک "خود مختار جمہوریہ" کے طور پر کی گئی جسے بعد میں (۱۹۲۹ء) ازبکستان سے الگ کر کے تاجکستان سوویت سوشلسٹ ریپبلک کے نام سے یونین جمہوریہ کا درجہ دیا گیا۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ تینتالیس ہزار ایک سو مربع کلومیٹر ہے اور آبادی ۵۳ لاکھ ہے، جس میں ۲۳٫۵ فیصد ازبک ہیں۔ روسیوں اور سلاف نسلوں کے دیگر شہریوں کا تناسب آزادی کے وقت (اواخر ۱۹۹۱ء) ۱۰ فیصد تھا۔ لیکن ان کی اکثریت اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ملک چھوڑ کر جا چکی ہے۔

وسط ایشیائی ریاستوں کے حکمرانوں کا آزادی مخالف رویّہ

سوویت یونین کا زوال اور نتیجتاً وسط ایشیائی ریاستوں کی آزادی دراصل بالٹک ریاستوں، خود روسی عوام اور سوویت یونین کے دیگر یورپی حصوں کے عوام کی طرف سے سیاسی اور معاشی پالیسیوں میں تبدیلی کے لیے جدّوجہد کا نتیجہ تھا۔ پیروسترائیکا اور گلاسناسٹ کے نام سے صدر گورباچوف نے ۸۰ کی دہائی کے وسط میں جو اصلاحات نافذ کیں۔ ان کی وجہ سے سوویت یونین کے یورپی حصے کی ریاستوں میں سیاسی اور معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے مطالبات نے بالآخر یونین سے استقلال و آزادی کی قومی تحریکوں اور جمہوری طریقوں سے شراکت اقتدار کی تحریکوں کی شکل اختیار کی۔

وسطی ایشیاء میں صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہاں حکمرانی ان جاگیر دار کمیونسٹوں اور قبائلی سرداروں کے ہاتھ میں تھی، جن کے اقتدار سے چمٹے رہنے کی واحد صورت یہ تھی کہ سوویت یونین اور سوویت نظام قائم رہے۔ سوویت دور میں وسطی ایشیا میں حکمرانی کرنے والے کمیونسٹ پارٹی کے

کار پردازان ہمیشہ سے "الٹرا سٹالنسٹ" رہے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے صدر گورباچوف کے پیروسترائکا اور گلاسناسٹ اصلاحات کے نفاذ میں کوئی دلچسپی نہیں لی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے صدر گورباچوف کے آخری دنوں میں ان کے خلاف ہونے والی بغاوت کی پشت پناہی کی۔ اس بغاوت کی ناکامی پر انہیں بہت زیادہ مایوسی ہوئی تھی۔

تاجکستان میں خاص کر حکمرانوں نے ملک کی آزادی میں بہت کم دلچسپی دکھائی۔ انہیں ماسکو میں اپنے "ماسٹروں" کی طرف سے تحفظ اور پشت پناہی سے محرومی قبول نہیں تھی۔ اسلامی شناخت کی بحالی اور آزادی سے انہیں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ تقریباً تمام نوآزاد وسط ایشیائی ریاستوں میں آج بھی سابقہ کمیونسٹ عناصر حکمران ہیں۔ جنہوں نے اولاً اقتدار تک پہنچنے کے لیے سابقہ کمیونسٹ دور کے ہتھکنڈوں اور سوویت طرز کے نمائشی انتخابات کا سہارا لیا اور پھر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے نام نہاد سیاسی استحکام برقرار رکھنے کا بہانہ بنا کر استبدادی طور طریقے اپنا لیے۔ ان حکمرانوں نے اپنے عرصہ ہائے اقتدار کو اکیسویں صدی کے اوائل تک بڑھانے کے لیے سوویت طرز کے ریفرنڈم منعقد کرانا شروع کر دیے۔ جن میں استعمال کیے جانے والے ووٹوں کا تناسب اور حکمرانوں کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کی شرح، بعینہٖ سابقہ سوویت عہد کے انتخابی نتائج کا نمونہ اور عکس بن کر سامنے آئے۔

غیرت مند تاجک مسلم معاشرہ

آزادی کے بعد بھی تاجکستان کے کمیونسٹ حکمرانوں نے تاجک مسلم عوام کی اس خصوصیت کا کوئی احترام نہیں کیا کہ انہوں نے سوویت دور جبر و استبداد میں بھی اپنی اسلامی شناخت کو دوسری وسط ایشیائی قومیتوں اور قبائل کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں برقرار رکھا۔ تاجکستان کی سرزمین رواں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں کمیونسٹ سرخوں کے خلاف وسیع پیمانے پر اسلامی مزاحمت کی تحریک کا مرکز رہی ہے۔ اگرچہ اس تحریک کو روسیوں کی دیکھا دیکھی مغرب اور حتیٰ کہ عالم اسلام میں بھی "بسماچیوں" بمعنی "رہزنوں" کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاجکستان کی سوویت عہد کی پوری تاریخ یہاں کے عوام کی اسلام اور اپنی اسلامی شناخت سے وفاداری اور غیر ملکی الحادی تہذیب کے خلاف مسلسل مزاحمت سے عبارت ہے۔ تاجک معاشرہ ایک غیرت مند مسلم معاشرہ ہے۔ جو اگرچہ سوویت عہد کے مذہب مخالف الحادی پروپیگنڈہ اور مذہبی تعلیم پر پابندیوں کی وجہ سے اسلامی تعلیمات میں گہرائی سے محروم ہے، لیکن اس کے اندر اسلام سے وفاداری مضبوط اور گہری بنیادوں پر قائم رہی ہے۔

تاجکستان کی اندرونی علاقائی تقسیم اور اس کے نتائج

کمیونسٹوں نے تنظیمی طور پر تاجکستان کے علاقے اس طور پر تقسیم کیے کہ جس سے شمال کی نسبتاً خوشحال، بہتر تعلیم یافتہ اور کمیونزم سے متاثرہ آبادی کے ہمیشہ اقتدار میں رہنے کی راہ ہموار ہوئی۔ لینن آباد (حالیہ خوجند) اور کلیاب کے اضلاع، جو کمیونسٹوں اور بالشویکوں کا گڑھ شمار ہوتے ہیں، کی صنعتی، تعلیمی اور سماجی ترقی پر توجہ مرکوز رکھی گئی۔ تاکہ مقامی حکومت پر ان کی گرفت کو یقینی بنایا جا سکے۔ دارالحکومت دوشنبے سمیت دوسرے علاقوں مثلاً "کرگن تیوبے"، "بدخشان" اور پامیر کے مرتفعات کی آبادی کو اسلامی تعلیمات اور اپنی مذہبی شناخت سے وفاداری کے جرم میں ہمیشہ "بیک ورڈ" رہنے دیا گیا۔ یہی وہ علاقے ہیں جو تاجکستان کے حالیہ تنازع میں حکومت مخالف اسلام پسندوں اور جمہوریت نواز عناصر کا حلقہ اثر شمار ہوتے ہیں۔

بحران کی تشکیل - ابتدائی مرحلہ

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تاجکستان کے کمیونسٹ حکمرانوں کے لیے سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں ملک کو ملنے والی آزادی حالات کی مسلط کردہ تھی۔ چنانچہ وہ آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ وہ سوویت عہد کے استبدادی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اقتدار سے چمٹے رہنے کے پروگرام پر بضد تھے۔ سوویت عہد کے آئین، دستور اور نظام کو بدلنے کا مطلب جمہوری طریقوں کو متعارف کرانا تھا، جس کے نتیجے میں ان کا بلاشرکت غیرے حکمرانی کے مزے لوٹنا ناممکن ہو جاتا۔ تاجکستان کے کمیونسٹ حکمرانوں کی اس ضد اور تاجک عوام کی امنگوں، ان کی تاریخ اور اپنی مذہبی اور تہذیبی اقدار کو بحال رکھنے کے لیے ان کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کو نظرانداز کرنے کی اس روش نے موجودہ تاجک بحران کو جنم دیا ہے۔

تاجکستان نے ۹ ستمبر ۱۹۹۱ء کو سوویت یونین سے علیحدگی اور اپنی آزاد و خودمختار حیثیت کا اعلان کیا۔ اس وقت تاجکستان کے صدر جناب قدرالدین اصلانوف تھے۔ انہوں نے روسی فیڈریشن کے صدر بورس یلسن کی تقلید کرتے ہوئے تاجکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی۔ لیکن ان کے اس فیصلے کو پارلیمنٹ میں موجود کمیونسٹ ارکان کی اکثریت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے صدر کو عہدہ صدارت سے الگ کرتے ہوئے ملک میں ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ کمیونسٹ پارٹی نے اپنا نام بدل کر سوشلسٹ پارٹی رکھ لیا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۹۱ء کو نئے صدارتی انتخابات منعقد کروائے گئے جن میں سابقہ کمیونسٹ پارٹی (موجودہ سوشلسٹ پارٹی) کے امیدوار رحمان نبی یوف مبینہ طور پر ۵۷ فیصد ووٹ لے کر حزب مخالف کے مشترکہ امیدوار جناب دولت خدا نذروف کے مقابلے

میں کامیاب ہوئے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں [حزب نہضت اسلامی، ڈیموکریٹک پارٹی اور رستاخیز] نے ان انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کیے جانے کے الزامات لگائے اور رحمان نبی یوف کی بطور صدر انتخابات میں کامیابی کو چیلنج کر دیا۔ واضح رہے کہ رحمان نبی یوف خجند اور کلیاب میں آباد روسی اور ازبک آبادی کے ساتھ ساتھ مقامی کمیونسٹ تاجک آبادی کے ووٹوں سے کامیاب قرار دیے گئے تھے۔ خود سرکاری نتائج کی رو سے یہ بات عیاں تھی کہ وسطی تاجکستان اور جنوب مشرقی علاقوں کے تاجک عوام نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔

رحمان نبی یوف اگرچہ سوشلسٹ پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے صدر منتخب ہوئے تاہم انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی سوویت عہد کے کمیونسٹوں کے رنگ ڈھنگ اپنانا شروع کر دیے۔ جنوری ۱۹۹۲ء میں انہوں نے کمیونسٹ پارٹی سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا۔ اور یوں سوشلسٹ پارٹی کو دوبارہ کمیونسٹ پارٹی کا نام دے دیا گیا۔ پارٹی نے اپنی کانفرنس منعقد کی اور اس میں برملا اس بات کا اعلان کیا کہ کمیونسٹ پارٹی کا احیاء دراصل سابق سوویت یونین کی بحالی کی جانب ایک قدم ہے۔ سوویت عہد کے استبدادی نظام کا احیاء کرتے ہوئے اجتماع اور پریس کی آزادی پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ دارالحکومت دوشنبہ کے ایک سابق میئر کو جس نے وسط شہر سے لینن کا مجسمہ ہٹانے کی جسارت کی تھی، بدعنوانی کے الزامات میں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ سوویت طرز کی آمرانہ حکومت کی بحالی اور تاجک عوام کی قومی امنگوں اور ملّی جذبات کی پامالی نے عوامی اضطراب کو دوچند کر دیا۔ بالآخر جب ۲ مئی ۱۹۹۲ء کو صدر رحمان نبی یوف نے "نیشنل گارڈز" کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کی "ملٹری ونگ" کی تشکیل کا اعلان کرتے ہوئے ۱۸۰۰ خود کار رائفلیں اپنے مدّاحوں اور اپنی پارٹی کے ارکان میں تقسیم کیں، تو دارالحکومت دوشنبہ کی سڑکیں عوامی غیظ و غضب کے سیلاب کا منظر پیش کرنے لگیں۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اس وقت تک احتجاج جاری رکھا، جب تک صدر رحمان نبی یوف نے ۱۱ مئی ۱۹۹۲ء کو حزب اختلاف کی جمہوریت نواز اور اسلام پسند جماعتوں کو شریک اقتدار کرنے پر رضامندی کا اعلان نہ کیا۔

جناب رحمان نبی یوف کے اس اعلان کے نتیجے میں پارلیمنٹ کی نصف نشستیں حزب اختلاف کو ملیں۔ اور اسے حکومت کے آٹھ عہدے بشمول نائب صدارت دیے گئے۔ حزبِ اختلاف کی حزب نہضتِ اسلامی کے نائب امیر جناب عثمان دولت نائب صدر بنا دیے گئے۔

صدر نبی یوف اور حزب اختلاف کے درمیان طے پانے والے سمجھوتے کی رو سے قائم ہونے والی اس نئی حکومت کو خجند اور کلیاب کے کمیونسٹ عناصر نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف خود صدر نبی یوف نے قوم پرستانہ جذبات کی تسکین کے لیے بعض علامتی اقدامات کے علاوہ تاجک عوام کے ملّی جذبات کے احترام پر مبنی ٹھوس پالیسیاں اختیار کرنے سے گریز کا عمل مسلسل جاری رکھا۔ صدر اور ان کے حامی کمیونسٹوں کی طرف سے سرکاری مشینری کو حزبِ اختلاف کی جماعتوں

کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کرنے کا عمل بدستور جاری رکھا گیا۔ انہیں فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کا داعی قرار دیا جاتا رہا۔ اسلامی بنیاد پرستی کا پشتیبان قرار دے کر انہیں ایرانی ایجنٹوں اور مذہبی پاپائیت پر مبنی اسلامی جمہوریہ کی تشکیل کے لیے کوشاں عناصر کا ٹولہ قرار دیا جاتا رہا۔ چنانچہ مخلوط حکومت کے اندر رہتے ہوئے بھی حزبِ اختلاف اور صدر رحمان نبی یوف اور ان کے حامی کمیونسٹ عناصر کے درمیان فاصلے بڑھتے رہے۔ اور نتیجتاً اتحادی حکومت ملک کے اقتصادی مسائل کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہ کر سکی۔ افراطِ زر کی شرح ۱۰۷ فیصد ہو گئی اور ملکی پیداوار ۸،۷ فیصد کم ہو گئی۔

تاجک عوام اور حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے حامی عناصر اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک رحمان نبی یوف عہدہ صدارت پر متمکن ہیں سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کی توقعات عبث ہیں۔ عام تاثر یہ تھا کہ صدر رحمان نبی یوف حزبِ اختلاف کو شریک اقتدار کرنے کے باوجود، جمہوریت متعارف کرانے، آزاد معاشی پالیسیاں اپنانے اور شہری حقوق بحال کرنے کے اپنے وعدوں پر قائم رہنے کی بجائے محض وقت کا حصول چاہتے ہیں۔ چنانچہ عوام ایک بار پھر صدر نبی یوف اور کمیونسٹوں کے خلاف اپنے غیظ و غضب کے اظہار کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ صدر نبی یوف نے عوامی جذبات کا احترام کرنے کے بجائے اسلحہ کے زور پر اقتدار سے چمٹے رہنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں ایک ہزار سے زیادہ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ بہرحال ان کے خلاف عوامی احتجاج اتنا شدید تھا کہ انہیں ۷ ستمبر ۱۹۹۲ء کو عہدہ صدارت سے استعفیٰ دینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ گورنو بدخشاں کے خطے سے تعلق رکھنے والے اکبر شاہ اسکندروف کو، جو اس وقت پارلیمنٹ کے سپیکر تھے، عارضی طور پر ملک کا صدر بنا دیا گیا۔ صدر نبی یوف کے عہدہ صدارت سے علیحدگی کے لیے چلائی جانے والی اس تحریک کی حمایت میں حزبِ اختلاف کی تین معروف جماعتوں، حزبِ نہضتِ اسلامی، ڈیموکریٹک پارٹی اور رستاخیز (نیشنل فرنٹ) کے علاوہ پامیریوں کی نمائندگی کرنے والی جماعت "لعل بدخشاں" کے ارکان پیش پیش تھے۔

بیرونی مداخلت کی ابتداء - بحران کے ارتقاء کا دوسرا مرحلہ

صدر رحمان نبی یوف کے استعفیٰ اور پارلیمنٹ کے سپیکر جناب اکبر شاہ اسکندروف کے عہدہ صدارت سنبھالنے کے عمل کو وسطی ایشیا کے دیگر آزاد ممالک میں حکمران کمیونسٹ قیادتوں اور روسی حکومت نے خطرے کی گھنٹی سمجھا۔ ان کے لیے تاجکستان میں قوم پرستوں اور اسلام پسندوں کی اقتدار پر گرفت "اسلامی بنیاد پرستی" کی طرف سے آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کے پورے علاقے کو اپنی گرفت میں لینے کی ابتداء تھی۔ نوآزاد وسط ایشیائی ریاستوں میں حکمرانی کے مزے لوٹنے والے کمیونسٹوں اور روسی حکومت نے مئی ۱۹۹۲ء میں تاجکستان میں اسلام پسندوں اور قوم پرستوں کی طرف سے اپنی طاقت کے اظہار کے بعد سے ہی ایسے اقدامات پر زور دینا شروع کر دیا تھا جن سے خطے میں اسلامی احیاء کے

عمل پر قابو پایا جا سکے۔

جولائی ۱۹۹۲ء میں آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کے وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع کے ایک مشترکہ اجلاس میں ازبکستان کے صدر جناب اسلام کریموف نے افغانستان سے تاجکستان کے اسلام پسندوں کو مدد ملنے کے امکانات کے سدّباب کے لیے تاجک - افغان سرحد پر تعینات "دولت مشترکہ" کے فوجی دستوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی پرزور تجویز پیش کی۔ خود کریموف نے تاجکستان کے ساتھ ازبکستان کی سرحد کو بند کر دیا۔ اور دونوں ممالک کے درمیان فضائی سروس کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اوائل ستمبر ۱۹۹۲ء میں صدر رحمان نبی یوف کے خلاف عوامی تحریک کے دوران ازبکستان، کرغیزستان، قازقستان، اور روس کے صدور نے ان خدشات کا اظہار کیا، کہ تاجکستان میں اسلام پسندوں اور قوم پرست جمہوریت نواز عناصر کا غلبہ دولت مشترکہ کے تمام ممالک کے لیے خطرہ ہے۔ نبی یوف کے عہدہ صدارت سے استعفیٰ کے بعد تاجکستان میں آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کی امن افواج کے مزید دستے روانہ کر دیے گئے، جن میں غالب اکثریت روسی فوجیوں کی تھی۔

دوسری طرف نو آزاد وسط ایشیائی ریاستوں کے کمیونسٹ حکمرانوں اور روسی حکومت کی شہہ پر تاجکستان کے کلیابی اور خجندی کمیونسٹوں کی ملیشیا نے (اوائل ستمبر ۱۹۹۲ء میں رحمان نبی یوف کے استعفیٰ کے بعد) تاجکستان میں حکمران اسلامی اور جمہوری قوتوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کلیابی اور خجندی کمیونسٹ سبک سفاروف کی قیادت میں کمیونسٹ اقتدار کی بحالی کے لیے صف بستہ ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ملیشیا کو "پیپلز فرنٹ" کا نام دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اسلامی بنیاد پرستوں اور قوم پرستوں کے خلاف ایک عوامی تحریک برپا ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "پیپلز فرنٹ" ایک مسلح نیم فوجی تنظیم تھی، جس کی حکمت عملیوں کی تشکیل کی ذمہ داری سوویت عہد کے بدنام زمانہ اور سزا یافتہ اخلاقی مجرم سبک سفاروف کی تھی، اور میدانی کاروائیوں [Field operations] کی کمان فیض علی سعیدوف کے ہاتھ میں تھی۔ اوائل اکتوبر ۱۹۹۲ء ہی سے پیپلز فرنٹ کے دستوں نے حکومت کے خلاف اپنی مسلح کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتے (۲۴-۲۶ اکتوبر) میں پیپلز فرنٹ کے دستوں نے دارالحکومت پر چڑھائی کر دی۔ تاہم حکومتی افواج نے انہیں دارالحکومت سے باہر دھکیل دیا۔ نومبر ۹۲ء کے تیسرے ہفتے (۱۹ نومبر) میں پیپلز فرنٹ کی طرف سے خجند میں بلائے گئے پارلیمنٹ کے اجلاس نے رحمان نبی یوف کے سابقہ استعفیٰ کو خلاف ضابطہ قرار دیتے ہوئے ان سے از سر نو استعفیٰ لیا، اور صدر کا عہدہ ختم کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے چیئرمین کے طور پر امام علی رحمانوف کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پیپلز فرنٹ نے ازبک فضائیہ اور زمینی افواج کی امداد و حمایت سے دوشنبہ کی اسلامی جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پوری قوت سے دہشت گردی پر مبنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ تاجکستان میں حکمران قوم پرست جمہوری اور

اسلامی قوتوں کے حامی دستوں اور مسلح ملیشیاؤں نے اگرچہ کمیونسٹ ملیشیا "پیپلز فرنٹ" کے دستوں اور ازبک فضائیہ کی براہ راست ان کے ٹھکانوں اور حکومتی مراکز پر بمباری کی مقدور بھر مزاحمت کی، تاہم شدید لڑائی اور خون ریزی کے بعد روس اور ازبکستان کی فوجی مشینری کی مدد سے کمیونسٹوں نے موجودہ صدر امام علی رحمانوف کی قیادت میں دوشنبے میں حکمران اسلام پسند اور جمہوریت نواز پارٹیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ کمیونسٹوں کی نئی بننے والی حکومت کی کابینہ کے اکثر ارکان کی نامزدگی کٹر کمیونسٹ ملحد سنجک سفاروف کے ہاتھوں ہوئی، جو تاجکستان میں خون ریزی اور ظلم و بربریت کے لیے بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ نئی تاجک پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے سفاروف نے کہا:

"We will cleans Tajikistan and Russia from the democratic scum."

"ہم تاجکستان اور روس کو جمہوری جھاگ سے صاف کر دیں گے"

سفاروف اور فیض علی سعیدوف کی طرف سے اسلام اور جمہوریت کے خلاف کھلی جنگ کے اعلان نے ان کی جانیں لے لی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مارچ ۱۹۹۳ء میں کرگان تپہ کے علاقے میں ایک جھڑپ کے دوران ان دونوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا۔

کمیونسٹ حکومت کی طرف سے مخالفین کا قتلِ عام - بحران کے ارتقاء کا تیسرا مرحلہ

نئی کمیونسٹ حکومت نے اقتدار پر قبضہ مستحکم کرتے ہی اسلام پسندوں اور کمیونزم کے مخالفین کے خلاف پرزور مہم شروع کر دی۔ ظلم و بربریت اور قتل عام کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس کے نتیجے میں پانچ لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ جن میں سے تین لاکھ کے قریب تاجک آبادی افغانستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی۔ ۷۰ ہزار افراد کو کمیونسٹ حکومت کے اہل کاروں نے قتل کر دیا۔ ہجرت کرنے والوں کے گھروں کو پہلے لوٹا گیا اور پھر انہیں آگ لگا کر نیست و نابود کر دیا گیا۔ معاشی حالت دگرگوں ہو گئے اور روز مرّہ کی اشیائے صرف بازاروں سے ناپید ہو گئیں۔

شروع میں افغانستان ہجرت کرنے والے تاجکوں کو ناقابل برداشت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اقوام متحدہ مغرب اور عالم اسلام کی طرف سے کسی قسم کی امداد کی عدم دستیابی نے انہیں اپنے طور پر حالات کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ بھوک و افلاس اور بیماری کے ہاتھوں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں۔ افغانستان نے مقدور بھر ان کی مدد کرنے کی کوشش کی، لیکن اپنی دگرگوں معاشی حالت اور مختلف مجاہدین گروپوں کی آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے وہ تاجک مہاجرین کی کما حقہ مدد کرنے سے قاصر تھا۔ افغانستان میں تاجک مہاجرین کے بڑے بڑے کیمپ تخار، قندوس، مزار شریف اور جزجان میں واقع

ہیں۔

اس دوران بین الاقوامی صحافت نے تاجک مہاجرین کی مشکلات اور دوشنبے کی کمیونسٹ حکومت کے ہاتھوں ان پر ڈھائے جانے والے مظالم سے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔ مغربی اور روسی میڈیا میں اس بارے میں جو رپورٹیں شائع ہوئیں ان میں اس Theme پر زور دیا گیا کہ "روس، ازبکستان، تاجکستان اور دیگر وسط ایشیائی ریاستوں کی متحدہ افواج نے اسلام اور "اسلامی بنیاد پرستوں" کو زیر زمین جانے پر مجبور کر دیا ہے"۔ وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، شہری حقوق کا انکار، سیاسی آزادی اور خود جمہوریت کے قتل کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ کیونکہ تاجکستان میں جمہوریت اور سیاسی آزادی کے مطالبات کرنے والے "اسلام پسند" تھے۔ اور اسلام پسندوں کا جمہوری عمل کے ذریعہ برسر اقتدار آنا بھی مغرب کے لیے ناقابل قبول ٹھہر چکا ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک تاجکستان کی جنگ ایک قبائلی اور علاقائی جنگ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کمیونسٹ اور روسی افواج ہر اس شخص کو انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں، جو کمیونسٹوں کے اقتدار کے دوام کے لیے خطرہ بن سکے۔ علاقائی اور قبائلی شناخت اس سلسلہ میں بے معنی ہے۔

حزبِ اختلاف کی طرف سے گوریلا جنگ کی ابتداء - بحران کے ارتقاء کا چوتھا اور آخری مرحلہ

جولائی / اگست ۱۹۹۳ء میں صورت حال اس وقت مزید بگڑ گئی، جب حزب مخالف کے حریت پسندوں اور مجاہدین کے ہاتھوں ۲۵ روسی فوجی ہلاک ہوئے۔ یہ واقعہ حزبِ اختلاف کے گوریلا دستوں کی طرف سے کمیونسٹ حکومت کے خلاف باقاعدہ جنگ اور جہاد کی ابتداء ثابت ہوا، جو تاحال جاری ہے۔ اس جہاد کے تسلسل ہی کی بدولت دوشنبہ کی کمیونسٹ حکومت کو "غیر قانونی" حزبِ اختلاف کے ساتھ بات چیت شروع کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ روسی فوجیوں کی ہلاکت کے فوراً بعد روسی وزیر خارجہ پال گراچوف نے دوشنبہ کے دوروزہ دورہ کے اختتام پر کہا: "روسی فوجیوں کی ہلاکت کے ذمہ دار افراد کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا"۔ روسی فضائیہ نے شمالی افغانستان میں تاجک مہاجرین کے کیمپوں پر مسلسل بمباری شروع کر دی۔ اُدھر روسی بھاری توپ خانے نے بھی ان کیمپوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے سینکڑوں مہاجرین شہید اور زخمی ہو گئے۔ "روس کی قومی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے" ماسکو کے حکام نے تاجکستان میں مزید فوج اور اسلحہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ صدر یلسن نے اعلان کیا کہ "تاجک - افغان سرحد روسی سرحد ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری روس پر ہے"۔

صدر یلسن نے اس موقعہ پر مزید کہا:

"Why did we not have a plan to protect this border

which everyone must understand is effectively Russia's not Tajikistan's border".

"ہمارے پاس اس سرحد کی حفاظت کے لیے ایک منصوبہ کیوں نہ تھا۔ [اس] سرحد کے بارے میں ہر ایک کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تاجکستان کی بجائے روس کی سرحد ہے۔"

صدر یلسن نے اپنے سیکورٹی منسٹر وکٹر برانو سیکوف کو بھی تاجک افغان سرحد کے دفاع میں غفلت برتنے کے الزام میں برطرف کر دیا۔

روسیوں اور وسط ایشیائی حکمرانوں کے نزدیک تاجکستان کی اہمیت

تاجکستان کو روسی اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ اور یہاں وہ جمہوریت نواز قوتوں کے مقابلہ میں کمیونسٹوں کی مدد کرنے پر کیوں کمر بستہ ہیں؟ حالانکہ خود ماسکو میں صدر یلسن اور اُن کی حکومت بظاہر کمیونسٹوں کو نیچا دکھانے کی جنگ لڑ رہے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ یلسن کی جمہوریت نواز حکومت کو سابق کمیونسٹوں سے خطرات درپیش ہیں۔

روسیوں کے لیے تاجکستان کی اہمیت کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ تاجکستان کو نوآزاد وسط ایشیائی ریاستوں اور "اسلامی بنیاد پرستی کی لپیٹ میں آئے ہوئے افغانستان" کے درمیان ایک بفر سٹیٹ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ تاجکستان کو بنیاد پرستی کے وسط ایشیائی ریاستوں اور خود روس تک پھیلنے کے خلاف ایک Defence line سمجھتے ہیں۔ خود وسط ایشیائی ریاستوں کے کمیونسٹ حکمران بھی ماسکو کے حکمرانوں کے اس نظریہ کی مؤید ہیں۔

تاجکستان کے اندر رونما ہونے والی اس صورتحال کے بارے میں ازبکستان کی قیادت خاص کر بہت پریشان رہی ہے۔ ازبکستان کے فرغانہ، نمنگان اور سمرقند صوبوں میں اسلام پسندوں کی زبردست مقبولیت کے پیش نظر حکومت نے حزب مخالف کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی ہے۔ نئے دستور کی رو سے کسی بھی سیاسی پارٹی کو مذہبی یا قومی بنیادوں پر کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ترکمنستان اور کرغیزستان میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہاں کی قیادتیں بھی "اسلامی بنیاد پرستی" کے انتشار سے خوف زدہ ہیں۔ ترکمنستان کے صدر نیازوف روسی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ خود اُن کے ہم وطن انہیں "Cultural out-sider" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اُن کی حکومت انتہائی جابرانہ اور استبدادی انداز کی ہے۔

وادیٔ فرغانہ کے کرغیزستان میں شامل حصے میں بھی اسلام پسندوں کا زور ہے۔ اور کرغیزستان کے صدر عسکر اکیف سمجھتے ہیں کہ تاجکستان میں اسلام پسندوں کی اقتدار پر گرفت خود کرغیزستان کے اسلام پسندوں کے لیے ایک زبردست Encouragement ثابت ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجے

میں ان کے اقتدار کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

تاجکستان کے کمیونسٹ حکمرانوں نے روسیوں اور نو آزاد وسط ایشیائی ریاستوں میں حکمران کمیونسٹ ٹولے کے ان خدشات کا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ تاجک وزیر خارجہ نے ۱۹۹۳ء میں کہا تھا۔ "اگر 'Militant Islam' تاجکستان پر قبضہ مستحکم کر لیتا ہے، تو یہ ازبکستان، قازقستان اور کرغیزستان میں ضرور پہنچ کر رہے گا۔ حتیٰ کہ بالآخر یہ کریملن (ماسکو) کے دروازوں پر دستک دے گا"۔

۱۹۹۳ء میں صورت حال یہ تھی کہ روس، ازبکستان، تاجکستان، کرغیزستان، ترکمنستان اور قازقستان کے کمیونسٹ حکمران اس بات پر کمر بستہ تھے کہ "اسلامی انقلاب کو افغانستان سے تاجکستان کے راستے سابق سوویت یونین کے علاقوں میں آنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی"۔

تاجکستان کے بارے میں روسی حساسیت کی دوسری وجہ شاید یہ ہے، کہ روسیوں نے ابھی تک آزاد ممالک کی دولت مشترکہ کے ممالک کی آزادی کو استقلال کے معروف معنوں میں تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور وہ پھر سے اُنہیں روسی بالادستی کے حصار میں لانے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلام پسندوں اور جمہوریت نواز عناصر سے اُنہیں خطرہ ہے کہ وہ اُن کے اِس خواب کی تکمیل کے لیے خطرہ ثابت ہوں گے۔

روسی حساسیت کا تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ تاجکستان میں جمہوری اور اسلامی قوتوں کے برسرِ اقتدار آنے سے نہ صرف تاجکستان بلکہ وسطی ایشیا کے تمام ریاستوں کے ایک ایسے اسلامی بلاک میں شامل ہونے کے امکانات کو تقویت ملے گی، جس میں پاکستان اور ترکی کے علاوہ ایران جیسی "بنیاد پرست" اسلامی ریاست بھی شامل ہو گی۔ واضح رہے کہ زر نود سکی جیسے روسی قوم پرست پہلے ہی روسی رائے عامہ کو "شمال - جنوب تنازعہ" ختم کرنے کے حوالہ سے وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر روسی قبضہ کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

روس کی کمزوریاں

روسی قیادت اگرچہ ایک طرف تو یہ سمجھتی ہے کہ روسی مفادات کے تحفظ اور علاقے میں اسلامی بنیاد پرستی کے بڑھتے ہوئے نفوذ کو روکنے کے لیے اس کی افواج کی تاجک - افغان بارڈر اور تاجکستان کے اندر موجودگی ضروری ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ تاجک تنازعہ کی کیفیت بالکل وہی ہے جو افغان تنازع کی تھی۔ اور یہ کہ افغانستان کی طرح یہاں بھی لمبے عرصے تک ملوث رہنے کے نتیجے میں روسی فیڈریشن کی داخلی سلامتی کو خطرات درپیش ہو سکتے ہیں۔ روسی اخبارات نسبتاً آزادی کے ساتھ روسی Involvement پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ ان کے بقول "سرحدی جھڑپوں میں ہلاک ہونے والے روسی فوجیوں کے والدین کو کس طرح سمجھایا جا سکے گا کہ ایک آزاد ملک

(تاجکستان) کی سرحدات کی حفاظت کرتے ہوئے ان کے بیٹوں کا خون بہایا جانا ضروری تھا؟"

۱۹۹۳ء میں ماسکو کے سابق میئر اور روس کے مشہور سیاسی لیڈر گاوریل پاپوف نے تاجکستان سے روسی افواج کے انخلاء کا مطالبہ کرتے ہوئے روسی قیادت کو خبردار کیا تھا کہ "حالات بالکل اسی نہج پر چل رہے ہیں، جس کے نتیجے میں روسی افواج کو دس سال تک افغانستان میں ملوّث رہنا پڑا تھا اور جس کے نتیجے میں سوویت یونین کا انہدام ہوا"۔ ان کے مطابق "تاجکستان میں روسی افواج کی مداخلت روس کے اندر جاری معاشی اور سیاسی اصلاحات کی تباہی پر منتج ہوگی"۔

خود روسی فوجی تاجکستان میں لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ روسی حکومت کو تاجکستان بھجوانے کے لیے فوجیوں کو راضی کرنا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ایک روسی فوجی کے بقول:

"I do not want to be in Tajikistan guarding the border. All the guys who have come here have regretted it".

"میں تاجکستان میں رہ کر سرحد کی حفاظت کرنا نہیں چاہتا۔ جتنے بھی لوگ [فوجی] یہاں آئے ہیں، انہیں اپنی اس حرکت پر پشیمانی ہے"۔

روسی حکومت تاجک حزب اختلاف کے گوریلوں کی طرف سے کیے جانے والے حملوں میں ہلاک ہونے والے روسی فوجیوں کی تعداد کم بتا کر خوف و ہراس کم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ تاجک - افغان سرحد پر متعین دو سو ایک ویں روسی ڈویژن کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا:

"When I watch the news about Tajikistan I feel like laughing. We lower all the figures to try not to frighten people".

"جب میں تاجکستان سے متعلق خبریں دیکھتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ ہم تمام اعداد و شمار کم کر کے بتاتے ہیں تاکہ لوگ خوفزدہ نہ ہوں۔"

چنانچہ روسی قیادت اگرچہ ایک طرف پر عزم انداز میں وسطی ایشیا اور خود روسی فیڈریشن کے مُسلم اکثریتی علاقوں میں اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ کو روکنے پر مصرّ ہے وہیں وہ تاجکستان میں زیادہ عرصہ تک اپنی افواج کو ملوّث رکھنے پر بھی تیار نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں خود روسی مملکت کا شیرازہ بکھرنے کے خطرات اُنہیں پریشان کیے ہوئے ہیں۔

بحران کے حل کے لیے مختلف فریقوں کی حکمت عملیاں

تاجکستان کی حکومت

حزب مخالف کے ساتھ تاجکستان کی کمیونسٹ حکومت کا رویّہ شروع میں انتہائی جارحانہ تھا۔ وہ ان

کے ساتھ کسی قسم کی گفتگو اور مذاکرات کے لیے تیار نہیں تھی۔ ۱۹۹۳ء میں تاجکستان کے وزیر اعظم نے کہا تھا:

"It was impossible to negotiate with the Islamic opposition. With a civilized opposition it would be possible to negotiate but not with these people who talk only with guns."

"اسلامی حزبِ اختلاف کے ساتھ مذاکرات کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک مہذب حزبِ اختلاف کے ساتھ بات چیت کی جا سکتی ہے۔ لیکن اُن لوگوں کے ساتھ نہیں جو صرف بندوق کی زبان جانتے ہیں"

تاجکستان کے وزیر خارجہ جناب رشید علی موف نے بھی ۱۹۹۳ء ہی میں کہا تھا:

"Tajikistan would not negotiate with Islamic rebels"

"تاجکستان اسلامی [مسلمان] باغیوں سے بات چیت نہیں کرے گا۔"

لمبے عرصے تک تاجکستان میں اپنی افواج کے قیام کے ممکنہ خطرناک نتائج سے سہمی ہوئی روسی قیادت کی طرف سے پڑنے والے دباؤ اور حزبِ اختلاف کے گوریلوں کی عسکری کامیابیوں کے نتیجے میں ۱۹۹۴ء کے اوائل میں تاجکستان کی حکومت کے رویّے میں بظاہر لچک پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ اس نے حزبِ مخالف کے ساتھ مذاکرات پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اور تب سے فریقین کے درمیان ماسکو، تہران اور اسلام آباد میں مذاکرات کے تین ناکام ادوار منعقد ہو چکے ہیں۔ (ماسکو مارچ ۹۴) (تہران جون - ستمبر ۹۴) (اسلام آباد اکتوبر - نومبر ۹۴) موجودہ صورت حال یہ ہے کہ روس اور مغرب کی اشیر باد سے، تاجکستان کی حکومت ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہے، جس کے مقاصد میں ایک طرف مذاکرات کے عمل کو طویل تر کر کے حکومت پر اپنی گرفت مستحکم کرنا اور اسی دوران مسلسل ایسے اقدامات اٹھانا شامل ہے جن سے روسی فوجوں کی امداد سے اقتدار پر اپنے ناجائز قبضہ کو قانونی شکل دی جا سکے۔ دوسری طرف مسئلہ کے پُرامن تصفیہ کے لیے مذاکرات جاری رکھنے پر مسلسل رضامندی ظاہر کرتے رہنے لیکن درحقیقت اصل اور بنیادی مسائل پر بات چیت سے مسلسل پہلوتہی کے ذریعہ تاجک حکومت حزبِ مخالف کو مذاکرات سے مایوس ہو کر واحد دستیاب انتخاب یعنی مسلح جدّوجہد جاری رکھنے کے اعلان پر مجبور کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ بین الاقوامی رائے عامہ کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ حزبِ مخالف دہشت گردوں اور مذہبی انتہا پسندوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو صرف بندوق کی زبان سے آشنا ہے اور جو مسائل کے سیاسی حل پر یقین نہیں رکھتا۔

تاجکستان کی کمیونسٹ حکومت کی طرف سے تاجک امن مذاکرات میں شرکت کے پسِ پردہ اصل مقاصد حکومت پر اپنی گرفت مستحکم کرنے کے لیے وقت کا حصول اور اس دوران انتخابات، اور ریفرنڈم

وغیرہ کا ڈھونگ رچا کر اپنے وجود کو مصنوعی جواز فراہم کرتا ہے۔ حکومت نے جمہوریت کے بنیادی تقاضوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ۶ نومبر ۱۹۹۴ء کو صدارتی انتخابات اور صدر کے عہدہ کی بحالی کے لیے ریفرنڈم منعقد کروایا۔ من پسند نتائج کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کا ارتکاب کیا گیا۔ حتیٰ کہ دوشنبے میں قائم تنظیم برائے یورپی تعاون و سلامتی کے مشن کے سربراہ گانچو گنچیف کو کہنا پڑا:

"There is not a basic level of democracy"

یعنی "تاجکستان میں جمہوریت کی بدایات بھی موجود نہیں ہیں"۔

یہی وجہ تھی کہ بین الاقوامی برادری اور کانفرس آن سیکورٹی اینڈ کوآپریشن ان یورپ (CSCE) نے ان انتخابات کی نگرانی کے لیے اپنے مبصّر بھجوانے سے انکار کر دیا تھا۔ (CSCE) کے اہل کاروں نے کہا تھا کہ "آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کروانے کے لیے ضروری شرائط پوری نہیں کی گئیں"۔

۲۶ فروری ۱۹۹۵ء کو حکومت نے ملک میں پارلیمانی انتخابات منعقد کروائے۔ ان انتخابات میں، سوویت عہد کی یاد تازہ کرتے ہوئے، صرف ان امیدواروں کو شرکت کی اجازت دی گئی جن کی صدر امام علی رحمانوف کے ساتھ وفاداری یقینی تھی۔ حزبِ مخالف کی اہم سیاسی جماعتوں کی طرف سے تو ان انتخابات میں شرکت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ ان کا بنیادی مطالبہ سوویت عہد کے نظام و آئین میں تبدیلی ہے، جس کے بغیر، ان کے موقف کے مطابق، کوئی بھی انتخابی عمل نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ ویسے بھی انہیں خلافِ قانون قرار دیا جا چکا ہے۔ (نام نہاد) اپوزیشن کی واحد جماعت، جسے ان انتخابات میں صرف پانچ امیدوار نامزد کرنے کی اجازت دی گئی، پیپلز یونٹی پارٹی تھی۔ PUP کے سربراہ سابق وزیر اعظم عبدالمالک عبداللہ جان ہیں۔ PUP نے بھی ۲۶ فروری ۱۹۹۵ء کے پارلیمانی انتخابات کے انعقاد سے صرف دو روز قبل ان کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ پارٹی نے اس بائیکاٹ کی وجہ "رحمانوف حکومت کی طرف سے غیر جمہوری ہتھکنڈوں کا استعمال" قرار دیا۔ حکومت نے PUP اور باقاعدہ حزبِ اختلاف کی (غیر قانونی) سیاسی جماعتوں کی طرف سے عدم شمولیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتخابات پروگرام کے مطابق منعقد کروائے۔ جن میں، دعویٰ کیا گیا کہ، ۷۵ فیصد ووٹروں نے حصّہ لیا۔ نتیجتاً ۱۸۱ ممبران پر مشتمل ایک ایسی پارلیمنٹ سامنے آئی، جس کے سارے کے سارے ارکان کمیونسٹ سرخے (Red Barons) ہیں۔

دوشنبے میں برسرِ اقتدار کمیونسٹ حکومت کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک طرف تو داخلی سیاسی محاذ پر اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے نمائشی جمہوری عمل کو جاری رکھا جائے۔ اور یوں اپنے وجود کو ہر ممکن جواز فراہم کیا جائے۔ اور دوسری طرف حزبِ مخالف کو مذاکرات کے ایک لامتناہی لیکن بے نتیجہ

عمل میں الجھا کر اس کے گوریلوں کو آہستہ آہستہ تلاش روزگار اور حصولِ معاش کے سلسلہ میں منتشر ہونے پر مجبور کیا جائے۔ اور تیسری طرف بین الاقوامی برادری میں حزب مخالف کی "اسلامی عسکریت پسندی" اور "مذہبی جنونیت" و "بنیاد پرستی" کو اتنا اچھالا جائے کہ مغرب، امریکہ اور خود عالم اسلام کے مغربیت زدہ حکمران ان کے استیصال کے سلسلہ میں دو شنبے حکومت کی جمہوریت کش استبدادی کاروائیوں سے صرف نظر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

تاجک حزبِ مخالف

تاجک حکومت کے برعکس حزبِ مخالف شروع میں مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ کے سیاسی حل پر زور دیتی رہی۔ اگرچہ وہ اس سلسلہ میں روس اور ازبکستان کو تنازعہ میں فریق ہونے کی حیثیت سے مذاکرات میں شریک کرنے پر زور دیتی رہی۔ لیکن ۱۹۹۲ء کے اواخر میں روس اور ازبکستان کی پشت پناہی سے تاجک حکومت کی طرف سے اپوزیشن کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں اور پھر ۱۹۹۳ء کے وسط سے روس اور ازبکستان کی طرف سے تاجکستان کی حکومت پر حزبِ مخالف کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کے لیے پڑنے والے دباؤ کے باوجود تاجک حکومت کی طرف سے مذاکرات سے انکار کے نتیجے میں حزبِ مخالف اس نتیجے پر پہنچی کہ تنازع کا واحد حل جہاد ہے۔ چنانچہ حزب نہضت اسلامی کے نائب امیر جناب محمد شریف ہمت زادہ نے (Impact Internatianal) لندن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

> "Initialy I was of the view that the problem can be solved by political means but now it is my firm belief that Jihad is the only course to resolve the issue".
>
> "شروع میں میرا خیال تھا کہ تنازعہ کو سیاسی ذرائع سے حل کیا جا سکتا ہے، لیکن اب میرا پختہ ایمان ہے کہ تنازعہ کو حل کرنے کے لیے واحد راستہ جہاد ہے۔"

حزب اختلاف کو اس بات کا احساس ہے کہ بدلتے ہوئے عالمی حالات میں جہاد کی تائید میں دنیا کے کسی بھی کونے سے مادی امداد کا حصول تو درکنار اخلاقی اور سفارتی آواز اٹھنا بھی مشکل ہے۔ لیکن جناب ہمت زادہ کے بقول "جہاد کی بنیاد ایمان اور توکل علی اللہ ہے۔ اگر مقصد نیک ہے اور ہدف نظام عدل کا قیام ہے، تو ذرائع کی فراہمی اللہ آسان کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں انسانی کاوشوں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے"۔

چنانچہ ۱۹۹۳ء کے وسط سے حزب مخالف نے حکومت کے خلاف اپنی جہادی کارروائیاں تیز تر کر دیں۔ اور نتیجتاً انہوں نے ملک کے تیس سے چالیس فیصد علاقے پر اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔ درحقیقت حزبِ مخالف کی عسکری کامیابیوں نے ہی دو شنبے کی حکومت کو ان سے مذاکرات پر رضامندی کا اعلان

کرنے پر مجبور کیا ہے۔

تنازع کو حل کرنے کے لیے حزب مخالف کی موجودہ سفارتی/عسکری حکمتِ عملی کا مقصد چار اہم اہداف کا حصول ہے۔

۱۔ ایک طرف بین الاقوامی رائے عامہ اور مغرب کو اپنے سیاسی پروگرام سے باخبر کر کے روس اور تاجک حکومت کی طرف سے ان کے بارے میں پھیلائے جانے والے اس تاثر کو زائل کرنا کہ وہ ایسے بنیاد پرستوں کا ٹولہ ہیں جو تاجکستان میں مذہبی پاپائیت پر مبنی نظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف بین الاقوامی برادری کو تاجکستان میں کمیونسٹوں کے اقتدار کے تسلسل سے علاقے میں جمہوریت کے مستقبل کو لاحق خطرات سے باخبر کر کے اسے دوشنبہ کے کمیونسٹ حکمرانوں کی حمایت سے دستکش ہونے پر آمادہ کرنا تاجک حزب اختلاف کی ڈپلومیسی کا پہلا ہدف ہے۔

۲۔ اپنی عسکری کارروائیوں کے تسلسل کو جاری رکھ کر دوشنبے کی کمیونسٹ حکومت کو مسلسل دباؤ میں رکھنا اور انہیں یہ احساس دلائے رکھنا کہ حزب مخالف کے جائز مطالبات کو تسلیم کئے بغیر اسے امن وسکون کے ساتھ حکومت نہیں کرنے دیا جائے گا، حزب اختلاف کی حکمت عملی کا دوسرا ہدف ہے۔

۳۔ روس کو تنازع کے فریق کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر مجبور کرنا حزب اختلاف کی پالیسی کا تیسرا ہدف ہے۔ چنانچہ تنازع کو جلد از جلد ختم کرنے کی روسی خواہش کے تناظر میں، روس کی طرف سے حکومت اور حزب مخالف کے درمیان مذاکرات کی میز پر طے پانے والے معاہدات کی پاسداری کی ضمانت کی فراہمی کے بغیر، حزب مخالف کا مذاکرات کے بائیکاٹ کی دھمکی دینے کا یہی مقصد ہے۔ حزب مخالف روس کو یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ تاجک امن مذاکرات میں طے پانے والے معاہدات کی پاسداری کی ضمانت فراہم کیے بغیر اس کی طرف سے تاجکستان میں جلد قیام امن کی توقعات رکھنا عبث ہے۔

۴۔ دوشنبے میں برسر اقتدار کمیونسٹ حکومت کی طرف سے حزب مخالف کے تمام بنیادی مطالبات ماننے سے انکار کے باوجود مذاکرات میں مسلسل شرکت سے بین الاقوامی برادری پر اس حقیقت کو واضح کرنا کہ ہٹ دھرمی اور سیاسی عدم رواداری کی مرتکب حزب اختلاف نہیں بلکہ حکومت ہے، حزب اختلاف کی حکمت عملی کا چوتھا بڑا ہدف ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والے امن مذاکرات کے تیسرے دور کے موقع پر حکومتی وفد کی طرف سے تہران مذاکرات میں طے پانے والے سمجھوتوں سے انحراف اور اسلام آباد مذاکرات کے لیے طے پانے والے اصل ایجنڈہ پر مذاکرات سے انکار کے باوجود حزب اختلاف نے جنگ بندی معاہدہ میں توسیع پر دستخط کر دیے تھے۔ حزب مخالف عالمی رائے عامہ اور مغربی دارالحکومتوں کو واضح طور پر یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ "دہشت گرد" اور "اقتدار کے بھوکے" وہ نہیں بلکہ اقتدار سے چمٹے رہنے پر مصر کمیونسٹ ہیں۔

جن کے نزدیک معاہدات کی کوئی اہمیت نہیں اور جو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

روسی قیادت

روس کی کمزوریوں کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ روسی قیادت کی خواہش ہے کہ کم سے کم مالی التزامات اور فوجی (Commitment) کے ساتھ تاجکستان کا تنازعہ اس طریقے سے حل کیا جائے کہ وہاں پاور سٹرکچر [حکومتی ڈھانچے] میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آنے پائے۔ وہ ایک طرف تو ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ تاجکستان کی موجودہ Puppet regime [کٹھ پتلی حکومت] کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کا سہارا فراہم کیا جائے۔ لیکن دوسری طرف اپنی غیر جانبداری کا تاثر بھی دے رہی ہے تاکہ حالات پر تاجکستان کی کمیونسٹ حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑنے کی صورت میں بھی اسے اپنے مفادات کی نگہداشت میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ روس کی اس دوطرفہ پالیسی کا ایک اور مقصد علاقے کی دیگر طاقتوں کو تنازعہ میں فریق بننے سے روکنا بھی ہے۔ تاجکستان میں اپنی افواج کی موجودگی کے بارے میں روسی حکومت کا موقف یہ ہے کہ ان افواج کا حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان تنازعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ان کی تاجکستان میں موجودگی کی بنیاد آزاد ممالک کی دولتِ مشترکہ (CIS) کے پلیٹ فارم پر طے پانے والے معاہدات کے تحت دوشنبے حکومت کی درخواست ہے۔ چنانچہ روسی قیادت مذاکرات کی میز پر تاجک حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان طے پانے والے معاہدات کے سلسلے میں کسی قسم کا التزام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ روسی قیادت جہاں "اسلامی بنیاد پرستی" کو وسطی ایشیا اور خود روسی علاقوں میں پھیلنے سے روکنے کے لیے تاجکستان میں اپنی افواج کی بقاء کو ضروری سمجھتی ہے وہیں اسے اس بات کا خطرہ بھی لاحق ہے کہ اگر تاجکستان سے اس نے اپنی افواج واپس بلالیں تو علاقے میں "بالادست فوجی طاقت" کی حیثیت سے اس کا امیج خراب ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے وسط ایشیائی ریاستوں کے روسی بالادستی کے حصار سے نکل کر جنوبی ایشیا اور مشرقی وسطیٰ کے اسلامی ممالک سے اپنا مستقبل وابستہ کرنے کے رجحان کو تقویت مل سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے تاجکستان میں جاری خانہ جنگی کی بدولت وہاں کی بگڑتی ہوئی معاشی اور اقتصادی صورتِ حال کو سنبھالا دینے کے لیے بھاری مالی ذمہ داریوں سے بھی جلد از جلد جان چھڑانے کی فکر ہے۔

تازہ ترین صورتِ حال

حزبِ مخالف کی طرف سے دسمبر ۱۹۹۴ء میں ماسکو میں منعقد کیے جانے والے تاجک امن مذاکرات کے بائیکاٹ کے اعلان کی بدولت مذاکرات کا اگلا دور ملتوی کر دیا گیا۔ بعد میں یہ طے پایا کہ

مذاکرات کا چوتھا دور قازقستان کے دارالحکومت الماآتا میں مئی کی ۲۲ تاریخ کو منعقد ہوگا۔ دریں اثنا حزبِ مخالف پوری دنیا اور بین الاقوامی برادری کو یہ باور کرانے کی زبردست کوششوں میں لگی رہی ہے کہ تاجکستان کے تنازع میں اصل کردار روس کا ہے۔ تاجک حکومت کو حاصل روسی پشت پناہی معاملہ حل نہ ہونے کا اصل سبب ہے۔ حزبِ مخالف کے ایک وفد نے جناب تورے جانزادہ کی قیادت میں فروری ۹۵ء میں امریکا کا دورہ کیا۔ اور اس دوران امریکی قیادت اور رائے عامہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کے "عسکریت پسند" "دہشت گرد" اور "اسلامی بنیاد پرست" ہونے سے متعلق روسی اور تاجک پروپیگنڈہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور بظاہر لگتا ہے کہ اس وفد کا دورہ کامیاب رہا ہے۔ جناب تورے جان زادہ کے مطابق "حکومتی اور عوامی سطحوں پر امریکہ اور مغرب میں حزبِ اختلاف سے متعلق بہت سارے شبہات کا ازالہ ہوا"۔

دوسری طرف حزبِ مخالف کی متحرک ڈپلومیسی، عسکری محاذ پر نئی کامیابیوں اور تاجک قومی معاملات پر اس کی مبنی پر انصاف جمہوری سوچ نے وسط ایشیائی قیادتوں میں بھی حزبِ مخالف سے متعلق شبہات کے ازالے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وسط ایشیائی قیادتیں اب محسوس کرنے لگی ہیں کہ اُنہیں خطرہ "بنیاد پرستی" سے نہیں بلکہ ان کے علاقوں میں روسی افواج کی مسلسل موجودگی سے ہے۔ چیچن تنازعہ میں روسی افواج کے کردار نے ان کے ان خدشات کو مزید تقویت دی ہے۔

۴ اپریل (۹۵ء) کو جناب تورے جان زادہ سے ملاقات کے بعد ازبکستان کے صدر اسلام کریموف نے نہ صرف مسئلہ کے پرامن حل پر زور دیا بلکہ تاجکستان سے اپنی افواج کے انخلاء کا بھی وعدہ کیا۔

۱۰ اپریل (۹۵ء) کو قازقستان کے شہر چمکنت [چمکند] میں ازبکستان، قازقستان اور کرغیزستان کے سربراہوں کے بند اجلاس کے اختتام پر جاری کیے جانے والے اعلامیہ میں تاجکستان کے صدر رحمانوف سے مطالبہ کیا گیا کہ "وہ مسئلہ کے فوجی حل کے بارے میں سوچنا چھوڑ کر اسے پرامن طور پر حل کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھائیں۔" قازقستان کے صدر نذریایوف نے تاجک فریقین میں صلح کے لیے ثالث کا کردار ادا کرنے کی بھی پیش کش کی۔

اپریل (۹۵ء) میں جب ماسکو نے حزبِ اختلاف کے گوریلا دستوں کی طرف سے افغان - تاجک سرحد پر تعینات روسی، تاجک اور CIS افواج پر پڑنے والے زبردست عسکری دباؤ کے پیش نظر مزید روسی دستے تاجکستان روانہ کرنے کا فیصلہ کیا، تو آزاد ممالک کی دولتِ مشترکہ (سابق سوویت یونین) کے تمام ممالک کو روس کی سربراہی میں، ایک مشترکہ دفاعی نظام میں منسلک کرنے کے نظریہ (Doctrine) کے پرجوش مؤید اور پیش کار روسی وزیر دفاع جنرل پاول گراچیف بھی اس فیصلے پر تنقید کیے بغیر نہ رہ سکے۔ شاید جمہوریہ چیچن میں روسی افواج کی براہِ راست مداخلت کے بعد بھی چھ ماہ کے طویل عرصے میں چیچن حریت پسندوں پر قابو پانے میں ناکامی نے جنرل پاول گراچیف کو اس بات کا

قائل کر لیا ہے کہ ماسکو کو دولتِ مشترکہ کے ممالک میں فوجی مداخلت کی کارروائیوں میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اگرچہ صدر یلسن نے بظاہر تاجکستان میں (Reinforcement) بھیجنے سے متعلق جنرل پاول گراچیف کی تنقید کو نظر انداز کیا، لیکن یوں لگتا ہے کہ روسی افواج کے تاجکستان میں دیر تک رہنے کے منفی نتائج ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تاجکستان کے صدر امام علی رحمانوف پر نہ صرف مذاکرات کے چوتھے دور میں شرکت کے لیے وفد بھیجنے کا اعلان کرنے کے لیے دباؤ ڈالا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر صدر رحمانوف کو مشترکہ حزبِ اختلاف کے سربراہ حزب نہضتِ اسلامی کے امیر، سیّد عبداللہ نوری کے ساتھ برابری کی سطح پر مذاکرات کرنے پر رضامندی کا اعلان کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔

۱۷ مئی (۱۹۹۵ء) کو افغان صدر برہان الدین ربانی کی دعوت پر افغان دارالحکومت کابل میں تاجک صدر امام علی رحمانوف اور سیّد عبداللہ نوری کے درمیان ہونے والے مذاکرات کو اگرچہ نتائج کے لحاظ سے کچھ زیادہ کامیاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن تاجک صدر کی طرف سے ۱۹۹۲ء میں تنازع کی ابتداء سے لے کر پچھلوں تین سالوں کے دوران حزبِ اختلاف کی جمہوریت نواز اور اسلام پسند قوتوں کے سربراہ کے ساتھ برابری کی سطح پر مذاکرات کرنے سے مسلسل انکار کے بعد یکایک اُن کے ساتھ مل بیٹھنے پر رضامندی بجائے خود اس حقیقیت کی غماز تھی، کہ ماسکو وسطی ایشیا میں اپنی کلائنٹ سٹیٹ [تابع ریاست] میں تصادم کی سیاست کے جاری رہنے کا مزید متحمل نہیں ہے۔ دریں اثنا تاجک صدر رحمانوف کی طرف سے حزبِ اختلاف کے لیڈر سیّد عبداللہ نوری کے ساتھ براہ راست مذاکرات پر رضامندی کو سفارتی حلقوں میں بھی انتہائی اہمیت دی گئی۔ اُن کے مطابق اقوام متحدہ کی طرف سے تنازعہ کے فریق کے طور پر حزبِ اختلاف کی حیثیت تسلیم کیے جانے کے بعد اس کی یہ دوسری بڑی کامیابی ہے کہ خود تاجک حکومت کے سربراہ نے بھی اپوزیشن لیڈر کی برابر کی حیثیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ دراصل تاجک حکومت اور حزبِ اختلاف کے وفود بالترتیب نائب وزیر خارجہ رحمت اسیف اور قاضی اکبر تورے جانزادہ کی قیادت میں وسط مئی (۱۹۹۵ء) میں کابل میں مذاکرات کے چوتھے دور کے ایجنڈہ پر بات چیت کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جو ۲۲ مئی سے قازقستان کے دارالحکومت الماآتا میں شروع ہونا تھے۔ لیکن کابل مذاکرات کے ابتدائی ادوار کے بعد حزبِ اختلاف کے وفد نے سیّد عبداللہ نوری کے ساتھ تاجک صدر رحمانوف کی براہ راست ملاقات کا مطالبہ پیش کر دیا۔ حکومتی وفد نے حزبِ اختلاف کے اس موقف سے دوشنبے کی حکومت کو مطلع کیا۔ جس کے نتیجے میں صدر رحمانوف اپوزیشن لیڈر سیّد عبداللہ نوری سے ملاقات کرنے ۱۷ مئی کو کابل پہنچے۔ تاجک حکومت اور حزبِ اختلاف کی اس پہلی سربراہی ملاقات میں ایک "میمورنڈم آف انڈر سٹینڈنگ" پر دستخط کرنے کے علاوہ اخباری رپورٹوں کے

مطابق صدر رحمانوف نے تاجکستان کے دستور میں بنیادی تبدیلیوں اور ترامیم سے متعلق حزبِ اختلاف کے مطالبے سے بھی اصولی طور پر اتفاق کیا۔ سربراہی ملاقات میں تاجک حکومت اور حزبِ اختلاف کے درمیان "لائنز آف کمیونیکیشنز" [خطوط اتصال] کھلی رکھنے پر بھی اتفاق کیا گیا۔

کابل میں تاجک سربراہی ملاقات کے دوران اور اس سے قبل میدانِ جنگ میں فریقین کے درمیان مسلح جھڑپیں مسلسل جاری رہیں۔ جو اس حقیقت کی غماز تھیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ "پوائنٹ آف اتھارٹی" سے بات کرنا چاہتے ہیں اور اپنے سیاسی مواقف کو عسکری کامیابیوں کا دباؤ رکھ کر پوری قوت سے منوانا چاہتے ہیں۔ جہاں تاجک حکومت نے دارالحکومت دوشنبہ میں ایک عمارت کی چھت پر راکٹ لانچر نصب کر کے صدارتی محل پر حملہ کرنے اور صدر رحمانوف کی جان لینے کی سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں وسیع پیمانے پر اپوزیشن کے حامیوں کی گرفتاریاں جاری رکھیں، وہیں حزبِ اختلاف کے گوریلا دستوں نے بھی تاجک - افغان سرحد پر متعین تاجک اور روسی بارڈر گارڈز پر راکٹوں سے حملے کر کے دوشنبہ کے حکمرانوں پر دباؤ بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ چورسد گاؤں اور سری گور کے علاقوں میں حزبِ اختلاف کے گوریلا دستوں کی کارروائیوں کے نتیجے میں متعدد تاجک سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

۱۹ مئی کو کابل میں تاجک سربراہ کانفرنس کے اختتام کے فوراً بعد ۲۲ مئی کو قازقستان کے دارالحکومت الماآتا میں تاجک امن مذاکرات کا چوتھا باقاعدہ دور شروع ہوا۔ ان مذاکرات میں حکومتی قیادت اوّل نائب وزیر اعظم محمد سعید عبید اللہ نے کی۔ جب کہ حزبِ اختلاف کے وفد کی سربراہی کے فرائض جناب اکبر تورے جان زادہ نے ادا کیے۔ مذاکرات جمعہ ۲ جون تک جاری رہے۔ ان مذاکرات کے دوران حکومتی وفد کے نامعقول رویّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی طرف سے تاجک تنازع میں ثالث کا کردار ادا کرنے والے یورو گوائے کے پیریز بالون نے کہا کہ "حکومت دستوری ترامیم اور تبدیلیوں کا متن تیار کرنے کے لیے کسی کمیشن یا کمیٹی کے قیام پر رضامند نہیں ہے۔ وہ صرف مجوّزہ تبدیلیوں پر ابتدائی مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہوئی ہے"۔ آرگنائزیشن آف سیکورٹی اینڈ کوآپریشن اِن یورپ (OSCE) کے مبصّر نے مذاکرات میں حکومتی رویّہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> "خوش فہمی کی کوئی بنیاد نہیں ہے کیوں کہ حزبِ اختلاف کے مطالبات حکومت کے لیے قطعاً قابل قبول نہیں ہیں جس کا واحد مقصد حکومت سے چمٹے رہنا ہے"۔

مذاکرات کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں کسی بھی قسم کے معاہدے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ چنانچہ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اگرچہ مختلف حلقوں کی طرف سے پڑنے والے دباؤ کے نتیجے میں حزبِ اختلاف کے ساتھ معاملہ کرنے سے متعلق تاجک حکومت کے موقف میں بنیادی تبدیلی

رونما ہوئی ہے، تاہم یوں لگتا ہے کہ دوشنبہ کے حکمرانوں کو کسی ایسے جامع معاہدہ پر دستخط کرنے کی جلدی نہیں ہے جس کے نتیجے میں فوری طور پر اُن کے اقتدار کے تسلسل کو خطرات لاحق ہوں۔ حکومتی وفد کی ہٹ دھرمی کی طرف حزبِ اختلاف کے مذاکراتی وفد کے سربراہ جناب اکبر تورے جانزادہ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا:

> "یہ مذاکرات کامیاب قرار نہیں دیے جاسکتے۔ درحقیقت یہ باعث شرم تھے۔ کیونکہ ہم ایسی پیش رفت کے حصول میں ناکام رہے جس کے نتیجے میں ہم اپنے عوام کو بحالی امن کا تحفہ پیش کرسکتے۔"

بامقصد مذاکرات سے مسلسل پہلوتہی پر مبنی تاجک حکومت کے اس رویے کا اصل مقصد مزید وقت کا حصول اور حزبِ اختلاف کے صبر کا امتحان لینا ہے۔ لیکن اِس خطرناک کھیل کے نتیجے میں دوشنبہ کے حکمران نہ صرف یہ کہ پڑوسی ممالک اور روس کی حمایت سے محرومی کے خطرات کو دعوت دے رہے ہیں، بلکہ بین الاقوامی برادری کی نظروں میں بھی اپنی ساکھ بری طرح مجروح ہونے کے امکانات بڑھانے کا سبب بن رہے ہیں۔ ٹال مٹول کے ان ممکنہ منفی نتائج سے رحمانوف حکومت بھی بے خبر نہیں ہے۔ چنانچہ الماآتا مذاکرات کے دوران قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بائیف نے دونوں وفود کے ساتھ ملاقات کے بعد اعلان کیا "مجھے دونوں طرف سے اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ دستوری ترامیم اور حزبِ اختلاف کو شریک اقتدار کرنے کے طریقہ کار پر (مذاکرات کے آئندہ دور میں؟) بات چیت کی جائیگی"۔

بحران کے حل کی کنجی حزبِ اختلاف کے پاس ہے

مسئلہ کے قابلِ قبول حل کی کنجی بہرحال حزبِ اختلاف کے پاس ہے۔ اگر تو حزبِ اختلاف اپنے گوریلا دستوں کے ذریعہ تاجک حکومت اور تاجک - افغان سرحد پر تعینات CIS امن افواج پر عسکری دباؤ برقرار رکھنے میں کامیاب رہتی ہے۔ اور حکومتی افواج اور CIS کے امن دستوں کی طرف سے جنگ بندی معاہدہ کی خلاف ورزیوں پر زبانی احتجاج کی بجائے فوری اور موثر جوابی عسکری کارروائیاں کرنے کی حکمتِ عملی پر بدستور عمل پیرا رہتی ہے، تو عین ممکن ہے کہ دوشنبہ کے پشتیبانوں کے اعصاب جواب دے جائیں۔ دوشنبہ کے یہ پشتیبان پہلے ہی مقامی رائے عامہ کی طرف سے زبردست دباؤ میں ہیں۔ روس، ازبک اور دولتِ مشترکہ (CIS) کے اِن دیگر ممالک کے شہری، جن کے فوجی دستے تاجک - افغان سرحد پر تعینات ہیں، اپنے فوجی جوانوں کی زندگیاں رحمانوف حکومت کی ہٹ دھرمی پر قربان کرنے پر پہلے ہی سراپا احتجاج ہیں۔ روس اور ازبکستان کی قیادتوں کو خاص کر اِس حقیقت کا بخوبی ادراک ہے کہ

تاجک حکومت کے غیر جمہوری رویّوں کے باوجود ان کی طرف سے اس کی تائید و حمایت ان کے سیاسی مستقبل کو مخدوش کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

سفارتی سطح پر اگر حزبِ اختلاف عالمی رائے عامہ کے سامنے اپنا موقف بہتر انداز میں پیش کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھتی ہے، اور مغرب کو روسیوں اور رحمانوف حکومت کے منفی پراپیگنڈہ کے اثرات سے نکالنے اور اس کے سامنے رحمانوف حکومت کا اصل چہرہ بے نقاب کرنے کے لیے اپنے بین الاقوامی روابط مستحکم کرنے کی روش پر قائم رہتی ہے، تو دوشنبہ پر بین الاقوامی دباؤ کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ دوشنبہ کے حکمرانوں پر بین الاقوامی برادری کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو بحران کے قابلِ قبول حل کی طرف ایک اہم پیش رفت میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر حزبِ اختلاف ایک مربوط سفارتی حکمتِ عملی وضع کرنے اور اس پر دلجمعی سے عمل پیرا ہونے میں کامیاب ہوتی ہے، تو بین الاقوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں متحرک کرنے میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ماسکو، تاشقند اور (CIS) کی دیگر دارالحکومتوں کے ساتھ بہتر روابط کے قیام کی کوششیں بھی حزبِ اختلاف سے متعلق ان کے خدشات کے ازالہ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ روس کے ساتھ بہتر روابط کے ذریعہ حزبِ اختلاف اپنے متعلق "روس دشمن" ہونے کے تاثرات زائل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ حزبِ اختلاف کے راہنما روس کے بڑی طاقت ہونے کا انکار کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے موقف کو نقصان پہنچائے بغیر علاقہ کی برتر طاقت کی حیثیت سے روس کو اس کے جائز مفادات کے تحفظ کا یقین دلایا جائے۔ اور یوں اسے بحران کے منصفانہ حل کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ بحران کے حل کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں میں روسیوں کی مخلصانہ شرکت ان کی کامیابی کی ضمانت ثابت ہو گی۔ ان کوششوں میں روسیوں کی بامعنی شرکت کا انحصار بہرحال حزبِ اختلاف کی طرف سے ماسکو کے ساتھ معمول کے تعلقات کے قیام کے لیے ہونی والی کوششوں کے حجم اور ان کی سنجیدگی پر ہے۔ حزبِ اختلاف کی طرف سے روس کے ساتھ اپنے روابط بہتر کرنے کے لیے اس وقت حالات انتہائی سازگار ہیں۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا کافی ہو گا، کہ ۲۶ مئی کو بیلوروس کے دارالحکومت منسک میں منعقد ہونے والی CIS سربراہ کانفرنس کے موقعہ پر اگرچہ تاجکستان میں تعینات CIS امن افواج [درحقیقت روسی افواج] کے مدّت قیام میں توسیع کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی موقع پر روس کی طرف سے تاجکستان کے صدر امام علی رحمانوف پر غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا گیا کہ اس کی طرف سے حزبِ اختلاف کے ساتھ بامعنی بات چیت سے مسلسل پہلوتہی کی وجہ سے "Moscow's, Patience was wearing thin" [ماسکو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔] حزبِ اختلاف کو ماسکو کی اس ڈسپریشن [یاسیّت] سے فائدہ اُٹھانے کے لیے فوراً میدانِ عمل میں آجانا چاہیے۔